منظّم نیکی

رہی یہ غلط فہمی کہ ہم زاہدوں اور گوشہ نشینوں کا ایک گروہ بنا رہے ہیں تو اگر یہ عمداً واقعہ کی غلط تعبیر نہیں ہے اور واقعی غلط فہمی ہی ہے تو اسے ہم صاف صاف رفع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیاداروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نیک لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہونے کی بنا پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور پرہیزگاری اس کو سمجھتے ہیں کہ دنیا کے معاملات ہی سے پرہیز کریں، اور دوسری طرف ساری دنیا کے کاروبار بدوں کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا ہے تو صرف خلقِ خدا کو دھوکا دینے کے لیے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے، جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانت دار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے آراستہ بھی ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے معاملات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری ہی میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے۔

بداخلاق اور بے اصول لوگوں کے لیے دنیا کی چراگاہ میں بس اسی وقت تک چرنے چگنے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا، اور جب ایسا گروہ تیار ہو جائے گا تو آپ یقین رکھیے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست اور معیشت اور مالیات اور علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اسی گروہ کے ہاتھ میں آ جائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ جل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گا لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ یہ انقلاب بہرحال رونما ہو کر رہے گا۔ (''جماعت اسلامی کے پہلے کل ہند اجتماع کی روداد''، ترجمان القرآن، جلد ۲۶، عدد ۳-۶، ربیع الاول تا جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ، مارچ تا جون ۱۹۴۵ء، ص ۱۴۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ملّت اسلامیہ کا

تابناک مستقبل اور ہماری ذمہ داری

پروفیسر خورشید احمد

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ آج آپ زندگی کے جس شعبے سے بھی متعلق کسی شخص سے بات کریں گے تو ٹیپ کا بند یہی ہوگا: ''حالات بڑے خراب ہیں۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ ایک مخصوص طبقے کو چھوڑ کر، ہر شخص شدید مشکلات اور مصائب کا شکار اور بے بسی اور مایوسی کی گرفت میں ہے''۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ جس چیز کا مسلمان معاشرے میں کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، یعنی حالات سے بیزار ہو کر خودکشی، اب اس میں بھی روز افزوں اضافہ ہے۔ ان حالات میں ''تابناک مستقبل'' کی بات کیا بے وقت کی راگنی نہیں؟

اس ماحول میں بالعموم ردعمل کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ''جسے دیکھو یہی کہتا ہے، ہم بیزار بیٹھے ہیں''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی حالات میں مستقبل اور خصوصیت سے تابناک مستقبل کا تصور اور اس کی طرف بڑھنے کی بات وقت کی سب سے بڑی ضرورت بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ اگر مستقبل کو حال سے بہتر بنانے کا احساس اور جستجو موجود نہ ہو تو پھر تاریکی کے چھٹنے اور حالات کو تبدیل کرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ بگاڑ اور تاریکی ہی کا تقاضا یہ ہے کہ بناؤ کی فکر ہو، روشنی کی تلاش ہو اور تعمیرِنو کے لیے جدوجہد کی جائے۔ ترقی اور اصلاح کا راستہ حالات کے آگے سپر ڈال دینے کا نہیں، حالات کو صحیح رخ پر موڑنے کے عزم اور عملی کوشش کا راستہ ہے۔ زندہ رہنے

اور پستی سے بلندی کی طرف اٹھنے، اپنی اور مظلوم اقوام کی قسمت بدلنے کا یہی راستہ ہے۔ خاص طور پر ہر مسلمان کے لیے، ہر مسلمان ملک کے لیے اور بحیثیت مجموعی پوری اُمت مسلمہ کے لیے تو اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ممکن ہی نہیں ہے۔ البتہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ''تابناک مستقبل'' کا صحیح تصور ہمارے سامنے ہو اور مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے جن عوامل اور اقدامات کی ضرورت ہے، ان کا پورا پورا شعور ہو اور عملاً ایسے مستقبل کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے نہ صرف جدوجہد کا راستہ اختیار کیا جائے بلکہ اس کے تقاضے بھی پورے کیے جائیں۔ اس لیے ہماری نگاہ میں جہاں حالات کی خرابی کا ادراک ضروری ہے، وہیں مستقبل کے صحیح تصور اور ایک تابناک مستقبل کے حصول کے لیے مطلوبہ لائحہ عمل کی تفہیم ازبس ضروری ہے۔

مستقبل کا حقیقی تصور

سب سے پہلا سوال ہمارے غور کرنے کا یہ ہے کہ مستقبل ہے کیا؟ جس تابناک مستقبل کی بات ہم کر رہے ہیں، اُس کے بارے میں سب سے پہلے ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس کی اصل وسعتیں کیا ہیں۔ یہ دنیا ایک عارضی گھرانا ہے۔ افراد ہی نہیں، اقوام کے لیے بھی یہ محدود امکانات سے عبارت ہے۔ البتہ اگر کوئی مستقبل ہے تو وہ صرف آخرت کا ہے، جو ہمیشہ کے لیے ہے۔ آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔ البتہ آخرت کی اس کامیابی کا انحصار اس دنیا ہی کی زندگی کی صحیح ترتیب و تنظیم پر ہے۔ دنیا ایک کھیتی کی مانند ہے، لیکن اس کھیتی سے تیار ہونے والی فصل یا منزلِ مقصود ہے یا آج کی کاروباری اصطلاح میں اس کی جو مارکیٹ ہے وہ آخرت ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ تابناک مستقبل وہ ہے جو آخرت میں تابناک ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مستقبل سے محفوظ رکھے جو آخرت میں تاریک ہو۔

جب ہم اس موضوع پر انفرادی یا اجتماعی طور پر، ایک گروہ یا ایک قوم کی حیثیت سے، پاکستانی یا اُمت مسلمہ کے فرد کی حیثیت سے غور کریں تو ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل تابناکی اور اصل کامیابی اور اصل روشنی آخرت کی زندگی کی ہے۔ وہی ہمارا ہدف ہونا چاہیے۔ یہاں جو مشکلات بھی ہوں، جو صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، اور پریشانیاں اور دشواریاں پیش آئیں

بلکہ بظاہر جو ناکامیاں ہوں، وہ سب عارضی، وقتی اور غیر حقیقی ہیں۔ حقیقی کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔ اس لیے جس تابناک مستقبل کا ہم خواب دیکھ رہے ہیں اور جس کے لیے ہم دعائیں کر رہے ہیں، جس کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے وہ آخرت کی کامیابی ہے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہمارے اوپر ایک بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے ہماری بشری کمزوریوں کو سامنے رکھ کر وعدہ فرمایا کہ اصل ہدف اور حقیقی کامیابی تو صرف آخرت کی کامیابی ہے لیکن تم کو دنیا میں بھی اس کی کچھ جھلکیاں دکھا دی جائیں گی، گویا اس کا کچھ حصہ تمھیں دنیا میں بھی میسر آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے انقلابی پیغام اور مشن کا یہ بڑا اہم پہلو ہے کہ اس میں دنیا کی تعمیر اور اصلاحِ انسان، اور یہاں انصاف اور خیر کا حصول اور غلبۂ آخرت کی کامیابی کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔ یہ پیغام اور مشن دوسرے مذاہب اور فلسفوں سے ہٹ کر ہے کہ اس میں وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اٰل عمرٰن ۳:۱۳۹) کی بشارت موجود ہے کہ دیکھو حوصلہ نہ ہارنا اور نہ غم کرنا، اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے، یعنی دنیا میں بھی تم کو کامیابی ہوسکتی ہے بشرطیکہ سچے معنی میں اہلِ ایمان کا رویہ اور کردار اختیار کرو۔ یہاں بھی حالات بدل سکتے ہیں، یہاں بھی تاریکیاں چھٹ سکتی ہیں، یہاں بھی زمین اپنی نعمتیں اُگل سکتی ہے اور آسمان اپنی برکتیں نازل کرسکتا ہے اور اس طرح یہ آخرت کی کامیابی کا آغاز ہوسکتا ہے۔ انتہا تو بہرحال آخرت ہی میں ہے البتہ آغاز یہیں سے ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ایک تسلسل ہے۔ اس پہلو سے دنیا میں مستقبل کے تابناک ہونے کی خواہش کرنا، اس کی تمنا اور دعا کرنا، اس کے لیے کوشش اور جدوجہد کرنا بھی دراصل اسلام کے مشن کا ایک حصہ ہے۔

قرآن کی روشنی میں

اسی لیے ہمیں دعا کی صورت میں جو ہدف اور مشن دیا گیا وہ یہ ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ (البقرہ ۲:۲۰۱) ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا''۔

قرآن نے اہلِ تقویٰ کو یہ بشارت بھی دی ہے کہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف ۷:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی کش مکش کے بارے جس سنت الٰہی کا واشگاف اعلان کیا ہے وہ تو ہے ہی یہ کہ:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۱)

اور اعلان کر دو کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔

اللہ کا قانون اور تاریخ کا فیصلہ بلاشبہہ یہی ہے کہ:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ (الانبیاء ۲۱:۱۸)

مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔

اللہ کا وعدہ ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ○ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ○ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ○ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ○ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ○ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ○ (الصّٰفّٰت ۳۷:۱۷۱-۱۷۹)

اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔ پس اے نبیؐ، ذرا کچھ مدت تک انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تحریک کو مخاطب کر کے یاد دلایا جاتا ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (الانفال ۸:۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے' زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا' تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تم کو جاے پناہ مہیا کر دی' اپنی مدد سے تمھارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمھیں اچھا رزق پہنچایا' شاید کہ تم شکرگزار بنو۔

غلبۂ حق کی نوید تمام صحف سماوی میں مرقوم ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ○ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ○ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (الانبیاء ۲۱:۱۰۵-۱۰۷)

اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے اور اے نبیؐ، ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

دنیا میں کامیابی اور آزمایش دونوں ہی اہلِ ایمان کی تقدیر ہیں:

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ (الاعراف ۷:۱۲۹)

قریب ہے وہ وقت کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے' پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

حق و باطل کی اس کش مکش میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ شکست و فتح دونوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس عمل سے گزرے بغیر منزل مقصود حاصل نہیں ہوتی لیکن استقامت اور وفاداری سے جو جدوجہد کی جائے گی' وہ بالآخر کامیاب ہو کر رہے گی:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ط وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ

النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۭ (اٰل عمرٰن ۳:۱۴۰)

اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں' اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہیں۔

مخالفت کے طوفان اہل ایمان کے عزم و ہمت اور توکل اور ایقان میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں اور جب وہ استقامت دکھاتے ہیں تو پھر اللہ کی مدد آتی ہے اور وہ غالب و کامران رہتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْۗءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۷۳-۱۷۴)

جن سے لوگوں نے کہا کہ ''تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں' ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا: ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔ آخرکار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے' اور ان کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انھیں حاصل ہوگیا' اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

اللہ کا وعدہ یہ بھی ہے کہ:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (الصف ۶۱:۸-۹)

یہ لوگ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں' اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ

وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور پھر اہل ایمان کو دعوتِ جہاد دی جاتی ہے جو آخرت کی کامیابی، جو فوزِ عظیم کا زینہ اور ضمانت ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا کہ:

وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الصف ۶۱:۱۳)

اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، وہ بھی تمھیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ، اہلِ ایمان کو اس کی خوشخبری دے دو۔

مشکلات اور سختیاں ضرور آئیں گی مگر پھر اللہ تعالیٰ آسانیوں اور کامیابیوں کا سامان بھی کر دے گا بشرطیکہ اس پر توکل کر کے اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور استطاعت بھر جدوجہد میں کمی نہ کریں۔

سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ○ (الطلاق ۶۵:۷)

بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ○ (الم نشرح ۹۴:۵-۶)

پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔

سب سے اہم چیز یہ ہے کہ کسی حالت میں بھی اللہ سے مایوس نہ ہوا جائے اور جدوجہد سے کسی صورت میں بھی پہلوتہی نہ کی جائے۔ مومن کی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ رب العزت سے تعلق ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کا مستقبل ہر حال میں روشن ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اگر اہلِ ایمان صحیح طریقے سے جدوجہد کریں تو انھیں آخرت کی کامیابی کے ساتھ دنیا میں بھی کامرانی حاصل ہوگی، اس لیے حالات کیسے بھی مشکل اور نامساعد ہوں، اہلِ ایمان کے لیے مایوسی کی کوئی گنجایش نہیں، قرآن کے الفاظ میں مایوسی کفر ہے اور اللہ کی رحمت کا

دروازہ ہر لمحے کھلا ہوا ہے۔ ہر حال میں مومن کی نظر اپنے اللہ کے وعدے، اس کی نصرت اور مدد، اس کی اعانت اور سرپرستی اور اس کی رضا اور خوش نودی پر ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کی زندگی کے ہر لمحے کو روشن اور اس کے ہر قدم کو تابناک مستقبل کی طرف پیش رفت بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں تابنا کی اور کامیابی، اگر وہ آخرت کی کامیابیوں کے تسلسل کے لیے ہو، تو وہ خود بھی اصل کامیابی کے موثر ذریعے کی حیثیت سے ایک مطلوب شے ہے، نامطلوب چیز نہیں ہے، لیکن معیار، آخرت کی کامیابی ہی کو ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر آخرت کی کامیابی کی بنا پر یہاں ہماری ساری زندگی صعوبتوں میں گزر جاتی ہے تو بھی یہ ناکامی نہیں۔ یہ بھی روشنی کی طرف اور تابنا کی کی طرف پیش قدمی ہے۔ البتہ یہ اللہ کا ہمارے اوپر بڑا انعام ہے، رحم ہے اور فضل ہے کہ اس نے ہماری کمزوریوں کی بنا پر ہم کو کسی ایسی آزمایش میں نہیں ڈالا جو ہماری استطاعت سے بڑھ کر ہو۔ انسان کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے اُس نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں زمین میں خلافت اور تمکن عطا کرے گا تاکہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اس دین کو دوسرے تمام طریقوں کے اوپر غالب کرنا اس کی سنت اور وعدہ ہے۔ یہ ساری چیزیں بھی مسلمان کا مقدر ہیں، ہماری تاریخ اور جدوجہد کا حصہ ہیں۔

مستقبل کی تابنا کی کے بارے میں ایک مومن کو ایک پل کے لیے بھی شک یا خوف میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یقیناً مشکلات ہیں، مسائل ہیں، پریشانیاں ہیں، تصادم ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایمان کی قوت، اللہ پر بھروسا اور اللہ کا یہ وعدہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کہ مایوس کبھی نہ ہونا، ہمت نہ ہارنا اور تابناک مستقبل کا صرف خواب ہی نہیں دیکھتے رہنا بلکہ اس کے لیے سرگرم عمل ہو جانا، یہ مسلمان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ تو کیسی ہی پریشانیاں اور کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں لیکن ہماری نگاہ اسلام کے روشن مستقبل ہی پر ہونی چاہیے۔

کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ جب ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ اس دعوت اور اس پیغام کا آغاز فرمایا تو حضرت ابوذر غفاریؓ اسلام قبول کرتے ہیں اور اُن کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ ابھی آغازِ وحی کا تیسرا اور چوتھا سال ہی ہے۔ اس موقع پر ایک اعرابی آتا ہے، اسلام قبول کرتا ہے اور حضورؐ اس سے یہ کہتے ہیں کہ اپنے قریے میں چلے جاؤ اور

انتظار کرو اس وقت کا جب یہ دین غالب ہوگا۔ آپؐ قریش کے سرداروں کو مخاطب فرما کر کہتے ہیں کہ کیا میں تم کو ایک ایسا کلمہ نہ بتا دوں کہ جس کو اگر تم مان لو تو پھر عرب اور عجم تمھارے تابع ہوں گے۔ وہ وقت کہ جب مکہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم اور تعذیب اس مقام پر تھی کہ حضرت خبابؓ جیسے اولوالعزم صحابی بھی بے چین ہو کر کہتے ہیں: یارسولؐ اللہ! اللہ کی مدد کب آئے گی؟ تو آپؐ فرماتے ہیں کہ خباب، کیا تم ابھی سے تھک گئے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ تم سے پہلی قوموں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا، ان کے گوشت کو ان کی ہڈیوں سے لوہے کی کنگھیوں سے جدا کیا گیا تھا اور ان کے جسم کو آروں سے کاٹ دیا جاتا تھا لیکن وہ اللہ کی راہ پر قائم رہتے تھے۔ لیکن دیکھیے حضور اکرمؐ یہ بات کہہ کر رک نہیں گئے بلکہ آپؐ نے فرمایا: خدا کی قسم! وہ وقت آئے گا جب ایک سوار تنِ تنہا صنعا سے حضرموت تک بے خوف و خطر سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اسے کوئی خوف نہ ہوگا، یعنی جب دین حق کو غلبہ حاصل ہوگا۔ پھر سب نے دیکھا وہ وقت آیا اور اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝ (قریش ۱۰۶:۴) کی کیفیت پیدا ہوگئی، یعنی بھوک سے تحفظ اور کھانے کی فراوانی اور خوف سے نجات اور امن کی نعمت۔ پھر وہ وقت کہ جب حضورؐ مکہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہجرت کا وقت ہے، بظاہر کس مپرسی کا عالم ہے۔ اپنے وطن کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور اس وقت جب سراقہ آپؐ کا تعاقب کر کے آپؐ تک پہنچ جاتا ہے تو آپؐ اسے کہتے ہیں کہ تمھیں کسریٰ کا کنگن دیا جائے گا۔ کیا وقت ہے لیکن کسریٰ کے کنگنوں کا ذکر کس اعتماد کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ کسریٰ کے کنگن آئے اور اس شخص کو دیے بھی گئے، سبحان اللہ!

تابناک مستقبل کی بات، میں کسی خوش فہمی یا شاعرانہ خیال آرائی کی بنا پر نہیں کر رہا بلکہ اللہ کی کتاب اور نبی پاکؐ کی سنت یہ دونوں ہمیں یہ اعتماد اور یقین دلاتے ہیں کہ جو بھی حالات ہوں اور جیسے بھی حالات ہوں وہ لوگ جنھیں اللہ نے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہ تابناک مستقبل کے بارے میں کبھی کسی غلط فہمی کا یا کسی مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتے۔

تاریخ کی گواہی

اگر آپ تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ تاریخ کے نشیب و فراز، قوموں کا

عروج و زوال' پستی و بلندی کے مناظر' کامیابی و ناکامی کی داستانیں' فتح و شکست کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اللہ کے اسی وعدے کا منظرنامہ پیش کرتے ہیں۔ معلوم تاریخ میں کم از کم ۳۶ عظیم تہذیبوں کے اسی سفر کی کہانی ملتی ہے اور عروج کے وقت ہر تہذیب کو یہی گمان تھا کہ اب اس کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں ہے۔ لیکن پھر چشمِ تاریخ نے دیکھا کہ اُسے زوال' انتشار اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری اقوام اُبھریں اور تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہا اور چلتا رہے گا۔ حضرت عیسیٰؑ نے سچ کہا تھا کہ کتنے آگے ہیں جو پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے پیچھے ہیں جو آگے نکل جائیں گے۔

قرآن کہتا ہے کہ اسی طرح ہم قوموں کے درمیان اتار چڑھاؤ' کامیابی و ناکامیابی اور زندگی اور موت کے دور لاتے رہتے ہیں۔ تاریخ سے صاف نظر آتا ہے کہ کوئی بھی دور ابدی یا مستقل نہیں۔ نہ کامیابی کو دوام ہے اور نہ ناکامی کو۔ حالات برابر بدلتے ہیں۔ اس لیے کسی ایک صورت حال کے اوپر یہ سمجھ لینا کہ اَب تو ہم بس پھنس گئے' اب کوئی راستہ نہیں۔ اب شکست ہمارا مقدر ہے اور دوسروں کے تابع دار بن کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں' یہ ایک مغالطہ ہے۔ جس کی نگاہ تاریخ پر ہوگی وہ کبھی بھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوسکتا۔

پوری تاریخ کو چھوڑ دیجیے۔ بہت سے لوگ آج موجود ہیں' میں خود بھی اپنے آپ کو اِن میں شامل کرتا ہوں جنھوں نے چشمِ سر سے دیکھا کہ سلطنتِ برطانیہ کا ایک زمانے میں کیا دبدبہ تھا۔ اسے دنیا کی حکمران قوت ہونے کا زعم تھا۔ غلبہ و بالادستی کو وہ اپنا مقدر سمجھتی تھی اور غرور کا یہ حال تھا کہ اس نے انگریزی زبان میں اس محاورے کا اضافہ کیا کہ:

Sun is never set in the British Empire.

چونکہ دنیا کی چوتھائی سرزمین پر اس کی حکمرانی تھی' اس لیے اس کا دعویٰ تھا کہ ہماری حکمرانی میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ ایک جگہ سے غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ سے اُبھر جاتا ہے۔ لیکن پھر ہم نے دیکھا کہ چند ہی سالوں میں اس کی سلطنت قصۂ پارینہ بن گئی اور کیفیت یہ ہوئی کہ وہ ایک سپر پاور سے سکڑ کر' صرف ڈیڑھ جزیرے کی حکومت رہ گئی۔ اور اب تو عالم یہ ہے کہ ہفتوں اس کی قلمرو میں سورج طلوع نہیں ہوتا! اسی طرح دولتِ برطانیہ نے انگریزی زبان میں اس محاورے کا

اضافہ کیا کہ Britannia rules the waves 'یعنی دنیا کے سارے سمندروں کے پانی پر ہما ری حکمرانی ہے لیکن پھر ہم نے دیکھا کہ Britannia had to waive the rule [یعنی برطانیہ کو حکومت چھوڑنا پڑی] اور سمندر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ تو یہ ہیں وہ نشیب و فراز' جن میں مغرور کے طلسم کا ٹوٹنا اور مظلوم کا بالاتر قوت بن جانا' یہ سب مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ امریکا اور اشتراکی روس دونوں بڑی طاقتیں (super powers) تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے برابر پنجہ آزمائی کر رہی تھیں۔ کیا آپ بھول گئے کہ روس کے سربراہ مملکت خروشچیف اقوامِ متحدہ کے ہال میں میز پر اپنے جوتے رکھ کر کے کہتا ہے کہ: I have come here to bury capitalism. (میں یہاں سرمایہ داری کا جنازہ نکالنے آیا ہوں)۔

اور پھر آپ نے دیکھا کہ کس طرح روس منتشر ہو جاتا ہے۔ گویا کہ محض ایک خاص موقعے پر کسی کا حاوی ہونا کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو ابدی (everlasting) سمجھا جائے۔ اقتدار' غلبہ اور قوت سب بڑی وقتی اور عارضی چیزیں ہیں۔ ہم نے خود اس کا نظارہ کیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایسے ابھی اور بہت سے تجربات اور مناظر ہم اور آپ دیکھیں گے۔ اس لیے یہ سمجھ لینا کہ اس وقت فلاں غالب ہے تو وہی غالب رہے گا' درست نہیں۔

اپنے ملک کی تاریخ بھی آپ دیکھ لیجیے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ ایک سرپھرے آمر (اسکندر مرزا) نے مکمل اقتدار کے زعم میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد پہلا بیان یہ دیا تھا کہ ہم ان مولویوں کو کشتیوں میں بٹھا کر کے سمندر پار بھیج دیں گے۔ لیکن اللہ کی قدرت کو آپ نے دیکھا کہ مولوی تو الحمدللہ وہیں ہیں۔ خود اس کو ایک مہینے کے اندر ملک چھوڑنا پڑا۔ یہاں کون تھا جس نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ''ہماری کرسی مضبوط ہے اور اس کو کوئی نہیں ہلا سکتا''۔ لیکن کون سی کرسی ہے جو باقی رہ گئی۔ آپ چاہے وسیع تر تاریخ کے پسِ منظر میں دیکھیں' چاہے اپنے دور کے عالمی سطح پر رونما ہونے والے نشیب و فراز کو دیکھیں اور خواہ آپ اپنے ملک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور کریں' کہیں بھی مایوسی کے لیے کوئی وجہِ جواز نظر نہیں آتی۔ اس سے انکار نہیں کہ تاریکی آتی ہے' شکستیں بھی ہوتی ہیں' لیکن ہر نشیب کے بعد فراز اور ہر شکست کے بعد کامیابی کا امکان بھی رونما ہوتا ہے۔ کیا خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی بلندیوں کے بعد اُحد کی ہزیمت نہیں دیکھی۔ کیا حدیبیہ

کے بعد فتح مکہ کا منظر رونما نہیں ہوا۔ کیا فتح مکہ کے بعد حنین سے سابقہ پیش نہیں آیا۔ یہ نشیب و فراز زندگی کی حقیقت ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو لے کر یہ سمجھ لینا کہ اب کچھ ممکن نہیں اور ہمت ہار جانا اور مایوسی میں گرفتار ہو جانا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ جس کی نگاہ تاریخ پر ہو' انسانی زندگی کے نشیب و فراز پر ہو وہ کبھی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ اس کے اوپر قرآن شاہد ہے' سیرت شاہد ہے' پوری تاریخ گواہ ہے اور میرا اور آپ کا تجربہ گواہ ہے۔ تو پھر کیوں ایک خاص وقت کی کیفیت کو ہم مستقل اور دوام کا درجہ دینے کی غلطی کریں۔ ہمیں چیزوں کو ان کے حقیقی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور اسی کی روشنی میں پھر ہمیں اپنا رویہ اور اپنا کرنے کا کام متعین کرنا چاہیے۔

قابلِ غور مثبت پہلو

اس پس منظر میں غور کرنا چاہیے کہ جہاں یہ ناقابلِ انکار حقائق ہیں اور جہاں اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ ان شاء اللہ حق غالب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی' وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیں ہمیشہ پوری دیانت کے ساتھ حالات کا بے لاگ جائزہ لینا چاہیے۔ خوش فہمیوں میں رہ کر کبھی کوئی فرد یا کوئی قوم وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ پاک میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں جو بھی نشیب و فراز آئے اور معرکے ہوئے' اُن کے اوپر خود زمین و آسمان کے مالک نے تبصرہ فرمایا ہے' احتساب کیا ہے' آیندہ کے لیے سبق سکھائے ہیں۔ یہ بھی حکمت ہے کہ اس پورے تبصرے کو ہمیشہ کے لیے قرآن کا حصہ اس لیے بنا دیا گیا تاکہ انسان خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ہمیں متنبہ کر دیا گیا اس وقت بھی جب اللہ کا نبیؐ ہمارے درمیان تھا' اگر انسانوں نے حقائق سے صرفِ نظر کیا' احکام سے روگردانی کی یا جو ذمہ داری سونپی گئی ہے اس کو ادا نہ کیا گیا تو جیتی ہوئی بازی پلٹ سکتی ہے۔ اور اسی طرح اگر حق کے داعی کی آواز پر لبیک کہا تو ہاری ہوئی بازی جیتی جاسکتی ہے۔ قرآنِ پاک میں یہ تمام چیزیں اسی لیے محفوظ کی گئی ہیں کہ ہم اُن سے سوچنے کا انداز' غور و فکر کا اُسلوب اور ہر دور میں حالات کے جائزے' اُن کا احتساب' ان کی تشخیص اور پھر ان کی روشنی میں لائحہ عمل کی تیاری کا کام انجام دے سکیں۔

اس وقت ہم بڑے نازک امتحانی دور سے گزر رہے ہیں۔ تاہم' اس میں کچھ بڑے مثبت

پہلو ہیں اور ان مثبت پہلوؤں میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ عددی اعتبار سے مسلمان آج 'ایک ارب ۴۰ کروڑ کے قریب ہیں جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ ہم ابھی اڑھائی تین سو سال کے کھلے کھلے استعماری دور کے تسلط سے نکلے ہیں۔ پورا عالمِ اسلام پانچ بڑی مغربی استعماری قوتوں کی گرفت میں تھا اور ہمیں سانس لینے تک کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے استعمار کی گرفت ڈھیلی پڑی' اور غلامی کے سائے چھٹے اور ۵۷ آزاد مسلمان مملکتیں وجود میں آئیں۔ تقریباً ۹۰ کروڑ مسلمان اِن آزاد مملکتوں میں ہیں۔ اور تقریباً ۴۰' ۴۵ کروڑ مسلمان ایسے ہیں کہ جو ۹۰' ۹۵ مسلم آبادیوں کی شکل میں غیر مسلم ممالک میں رہ رہے ہیں۔ یہ عددی قوت ہر ایک اعتبار سے بڑی اہم حقیقت ہے۔ معاشی' عسکری اور نظریاتی ہر اعتبار سے دنیا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں انسانوں کی اتنی بڑی تعداد اور ان کی یہ قوت ایک بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

پھر ان ممالک کا محلِ وقوع دیکھ لیجیے۔ دنیا کے کل زمینی رقبے کا تقریباً ۲۳ فی صد مسلمانوں کے اقتدار کے تحت ہے۔ اور یہ سارا علاقہ معاشی وسائل سے مالا مال ہے۔ پوری دنیا کی توانائی کے ۸۰ فی صد ذخائر ہمارے پاس ہیں۔ مالی وسائل اور جنگی اعتبار سے اور معاشی نقطۂ نظر سے تمام اہم راستے انھی علاقوں سے گزرتے ہیں۔ معاملہ خواہ زمینی رابطوں کا ہو' یا سمندری اور ہوائی' ان تمام میں مرکزی حیثیت مسلمان ممالک کی ہے۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جسے ہم آزادی کہہ رہے ہیں' وہ صحیح معنوں میں مکمل طور پر آزادی نہیں ہے۔ بظاہر قانونی اور سیاسی انداز میں ہم استعمار کی گرفت سے نکل گئے ہیں' لیکن ان کا فکری غلبہ' تہذیبی گرفت' عسکری اور معاشی قوت کا عدم توازن اور پھر اس وقت عالم گیریت اور گلوبل سسٹم جس انداز سے کارفرما ہیں تو اس میں ایک سوپر پاور عسکری اور سیاسی اعتبار سے' اور مغربی تہذیب فکری اور سائنسی' ٹکنالوجی اور ثقافتی اعتبار سے چھائی ہوئی ہے اور مسلمان ملکوں کی آزادی حقیقی آزادی کا رنگ اختیار نہیں کرسکی ہے۔ دوسرے الفاظ میں نوآبادیاتی تسلط ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا۔

اس نئے دور میں نوآبادیاتی استعماری تسلط کی شکل میں بڑی جوہری تبدیلی آئی ہے' اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ایک ملک کے لیے خواہ عسکری اعتبار سے وہ کتنا ہی

مضبوط کیوں نہ ہو، ممکن نہیں کہ وہ پوری دنیا کو زیادہ دیر تک اپنی گرفت میں رکھ سکے۔ بش چار سوا چار سال سے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نشانہ صرف ہم رہے، اُس کی قیمت ہم ادا کرتے رہے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خواہ وہ افغانستان ہو یا عراق ہو، سوپر پاور جو کچھ کرنا چاہتی تھی نہیں کر سکی اور وہ مجبور ہے کہ اپنی قوت کی کم مائیگی (limitations of power) کا بھی احساس کرے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے محض اپنی قوت کے زعم میں کر نہیں سکتی۔ اگر کہیں اسے جبر کی قوت سے غلبہ میسر آ بھی گیا ہے، تب بھی اس کا اقتدار بڑا کمزور اور محدود ہے اور اسے اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ ہر جگہ مزاحمت ہے اور یہ مزاحمت ایک بہت بڑے قومی اور مؤثر عنصر کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ سوپر پاور کی قوت کا مقابلہ اس کے سامنے سر جھکا دینے اور غلامی کو قبول کر لینے سے نہیں بلکہ سامراجی قوت کی مزاحمت کرنے سے ہوتا ہے۔ نائن الیون کے واقعے سے بڑے منفی نتائج رونما ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سوپر پاور کے لیے ہر میدان میں اپنی من مانی کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا جائزہ لیجیے۔ آج نہ صرف امریکا بلکہ پوری دنیا اُس سے کہیں زیادہ غیر محفوظ ہے جتنا اس واقعے سے پہلے تھی۔ طاقت کی اس ساری نمایش اور کشت وخون کے ذریعے افغانستان کو کھنڈر بنا دیا گیا۔ وہاں ۲۰ سے ۲۵ ہزار معصوم افراد شہید ہوئے۔ عراق میں ایک لاکھ سے زیادہ عام شہری شہید ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساری قوت اور وسائل کے بے محابا استعمال کے باوجود یہ سوپر پاور افغانستان ہو یا عراق کہیں بھی محفوظ نہیں۔

پھر آپ یہ دیکھیے کہ کس طرح عوامی بیداری کی ایک لہر ساری دنیا میں رونما ہوئی ہے۔ دنیا کے ہر سروے میں امریکا کی غیر مقبولیت بلکہ نفرت نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ ممالک جن کی قیادتیں بظاہر اس کے ساتھ ہیں، مثلاً خود ترکی کا ایک سروے یہ بتاتا ہے کہ ۸۰ فی صد سے زیادہ آبادی اُس سے نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔ جرمنی اور فرانس کے ۶۰ اور ۷۰ فی صد لوگ امریکا اور روس کی پالیسیوں سے بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ برطانیہ اس کا سب سے بڑا حلیف ہے لیکن وہاں عوامی ردِعمل کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر امریکا اور برطانوی حکومت کو چیلنج کر رہا ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح لوگوں نے احتجاج کیا۔ ۱۹ مارچ ۲۰۰۵ء کو عراق پر حملے کے

دوسال بعد پورے یورپ میں اس ناجائز جنگ کے خلاف شدید عوامی مظاہرے ہوئے ہیں۔

ہماری موجودہ فوجی حکومت بھی اس معاملے میں بش کے ساتھ ہے لیکن ملک کے کسی بھی کونے یا گوشے میں جا کر دیکھ لیجیے کہ عوام کے اس بارے میں جذبات کیا ہیں۔ نیوز ویک نے یہ دل چسپ اور عبرت آموز واقعہ ریکارڈ کیا ہے کہ افغانستان میں جس پاکستانی فوجی دستے نے ۱۰ افغانوں کو شہید کیا تھا جب اس کا کمانڈر جو غالباً لیفٹیننٹ کرنل کے رینک کا تھا، ہلاک ہوا اور اس کا جنازہ اس کے گاؤں میں آیا تو اس کے باپ نے اپنے بیٹے کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیوز ویک کے نمایندے نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کو بڑی تمناؤں سے فوج میں بھیجا تھا مگر اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ وہ جا کر مسلمانوں کو مارے۔ اس کی نماز جنازہ بش کو پڑھنی ہے تو پڑھے، میں باپ ہوتے ہوئے بھی اس غدار کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ یہ ایک فرد کا واقعہ نہیں ہے، ایک باپ کا واقعہ نہیں ہے، یہ ایک قوم کی سوچ ہے۔ یہی پوری اُمت مسلمہ کی سوچ ہے۔

اسی طرح انڈی پنڈنٹ کے نامہ نگار رابرٹ فسک نے ایک پورا مضمون افغانستان کے بارے میں لکھا ہے جس میں وہ کہتا ہے: میں جہاں بھی گیا ہوں امریکی بم باری سے جو لوگ شہید ہوئے ہیں، ان کے مزار لوگوں کے لیے مرجع بنے ہوئے ہیں۔ ہر جمعے کو وہاں عرس کا سماں ہوتا ہے اور امریکی فوجی تنہا باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ اس طرح دیکھیے بظاہر امریکا کا غلبہ ہے، خون بھی بہہ رہا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی غور طلب ہے کہ عوامی سطح پر اس کا ردِعمل کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں منفی اور مثبت، روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہیے۔ صرف ایک چیز کو نہ دیکھیے۔ ساری بربادی کے باوجود، میں تو اس صورتِ حال میں ایک تابناک مستقبل کے امکانات بچشمِ سر دیکھتا ہوں۔

لیکن یہ بات ضرور میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تابناک مستقبل آپ سے آپ نہیں آئے گا۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ تبدیلی مسلسل جدوجہد، قربانی اور ثابت قدمی سے آتی ہے، یہی اللہ کی سنت اور قانون ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے قانون اور سنت کو بدلتا نہیں۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ○ (فاطر ۳۵:۴۳) ''تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ

پاؤ گے اور تم اللہ کی سنت کو ٹلتی ہوئی ہرگز نہ دیکھو گے''۔

قانون یہ ہے کہ آپ کو اس تابناک مستقبل کے لیے کوشش کرنی ہوگی۔ آپ کو اس کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ مجھے اور آپ کو اس کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ پھر یہ تابناک ہوگا' اور کوئی چیز اس کو تابناک ہونے سے روک نہیں سکتی۔ لیکن اگر ہم اپنا فرض ادا نہیں کریں گے' ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے' یا ہم مایوسی کا شکار ہو جائیں گے تو پھر یہ مستقبل تابناک نہیں' تاریک ہوگا۔ کسی بھی کاروبار میں نفع نقصان دونوں ہوتے ہیں۔ بار بار نقصان ہوتے ہیں۔ آدمی دیوالیہ ہو جاتا ہے' دکان بند کرنی پڑ جاتی ہے۔ کارخانے پر قفل لگ جاتا ہے۔ لیکن کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ایک نقصان کے بعد آپ پھر نفع کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ ایک بار کاروبار میں نقصان ہونے کے بعد آپ پھر دوسرا کاروبار شروع کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اگر کاروباری زندگی میں آپ کا یہ رویہ ہے تو پھر سیاسی' تہذیبی' دینی اور ایمانی زندگی کے لیے آپ اِس سے ہٹ کر کے کیوں سوچتے ہیں؟

منزل اور مقصد کا شعور

تابناک مستقبل تو ہمارا مقدر ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہمارا مقدر ہے جب ہم اس کا حق ادا کردیں گے۔ اس کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ پہلی چیز خود احتسابی ہے۔ آپ دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیں کہ ہماری کمزوری کے اسباب کیا ہیں؟ پھر آپ یہ دیکھیں کہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صحیح لائحہ عمل کیا ہوسکتا ہے؟

جدوجہد اور اس کے نتیجے میں کامیابی کے لیے اولیں شرط ہے منزل اور مقصد کا شعور' یعنی انسان کا وژن' اس کا تصورِ حیات۔ میں اگر اسے ذرا زیادہ کھل کر کہوں تو اس کا ایمان اور ایمان کی بنیاد پر اُس کا مقصدِ حیات اور زندگی کے اہداف۔ اگر یہ کمزوری کا شکار ہو جائیں تو یہ سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑی ناکامی ہے۔ آج مسلمانوں کا معاملہ یہی ہے کہ اللہ کی کتاب بھی موجود ہے' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی موجود ہے' ہماری تاریخ بھی موجود ہے اور صلحاے اُمت کی کوششیں اور کارنامے اور خدمات بھی موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عملاً ہم

نے بھی زندگی کو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ میں اُن کی بات نہیں کر رہا جو دین سے اتنے غافل ہیں کہ صرف دنیا کو اپنا ملجا اور ماویٰ اور اپنا سب کچھ بنا چکے ہیں۔ میں اُن کی بات کر رہا ہوں جو نمازیں پڑھتے ہیں' جو روزہ رکھتے ہیں جو گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں بھی کرتے ہیں' جو صدقات و خیرات بھی دیتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اِس نماز کے اثرات ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر بھی پڑنے چاہییں۔ کیا ہماری ذمہ داری صرف نماز پڑھ لینے کی ہے یا جس خدا نے ہمیں نماز پڑھنے کے لیے کہا ہے' اس نے ہمیں یہ بھی کہا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ، یعنی نماز تو وہ ہے جو انسان کو فحش اور منکر سے روکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو پوری زندگی کو اللہ کی بندگی میں لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

ہم بڑے اہتمام سے رمضان کا استقبال کرتے ہیں' سحری اور افطار کا اہتمام کرتے ہیں' عیدیں مناتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ روزہ تو تقویٰ کے لیے ہے۔ یہ روزہ تو اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے ہے۔ قرآن نے تو اس کا مقصد اور حاصل یہ بتایا ہے کہ جس ہدایت' یعنی قرآن سے تمھیں سرفراز کیا ہے اسی پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکرگزار بن جاؤ (وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ البقرہ ۲:۱۸۵)۔ گویا روزہ تو اس مقصد کے لیے ہے کہ ہم قرآن کے پیغام کو پھیلائیں' اللہ کی حاکمیت کو قائم کریں اور دین کی سربلندی کی جدوجہد میں مسلسل مصروف رہیں۔

ایمان کی فکر اور ایمان کے مطابق زندگی گزارنے کا عزم ہماری قوت کی پہلی بنیاد ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنا جائزہ لے کر کے یہ دیکھیں کہ ایمان' ایمان کے تقاضے' زندگی کا مقصد اس کے اہداف اور وژن' اور اِس وژن کے ساتھ ساتھ پھر ایمان اور عمل کے تعلق کی کیا کیفیت ہے۔ اسلام میں ایسا کوئی تصور موجود نہیں ہے کہ ایمان عمل کے بغیر ہو' جس طرح عمل ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے اسی طرح ایمان بھی عمل کے بغیر نامکمل اور بے ثمر ہے' یہ دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ لہٰذا ہماری پہلی کمزوری ایمان کی' تصورِ زندگی کی' مقصودِ حیات کی' ہدف کی اور منزل کے شعور کی ہے۔ اگر اسے ہم درست کرلیں تو باقی تمام معاملات صحیح رُخ پر آسکتے ہیں۔ اور جب تک یہ درست نہ ہو تو تابناک مستقبل ایک خواب اور سراب رہے گا' وہ ہمارا مستقبل نہیں بن سکے گا۔

اخلاقی قوت

ایمان کے ساتھ دوسری بنیادی چیز اخلاقی قوت ہے۔ اخلاقی قوت کی بنیاد ایمان ہے۔ عبادات اِس قوت کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ وہ قوت ہے جو انسان کو سکھاتی ہے کہ وہ ظلم کو نہ برداشت کرے بلکہ اسے چیلنج کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صاف کہا کہ اگر تم اخلاق کے اعلیٰ مقام پر ہو گے تو پھر تم میں سے ہر ایک دس دشمنوں کے لیے کافی ہوگا۔ اور اگر تمھارے اخلاق کمزور ہو جائیں گے تو تم دو کے لیے کافی ہو جاؤ گے۔ لیکن آج معاملہ یہ ہے کہ ہم ایک کا مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس لحاظ سے ہماری دوسری کمزوری یہی اخلاقی قوت کی کمزوری ہے۔ اور اخلاقی قوت ایمان اور عبادات کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے جلا پاتی ہے اور دعوت الی الخیر اور قربانی دینے سے اس میں نمو اور ترقی رونما ہوتی ہے۔

مادی وسائل کی ضرورت

تیسری اہم بات مادی قوت ہے۔ اگر آپ مادی قوت کو حاصل کرنے میں غفلت برتتے ہیں اور مقابلے کی قوت پیدا کرنے کی فکر نہیں کرتے تو صرف ایمان اور اخلاق کے ذریعے سے آپ یہ بازی نہیں جیت سکتے ہیں۔ اسلام ہم میں حقیقت پسندی پیدا کرتا ہے اور فطرت کے قوانین کے احترام کی تلقین کرتا ہے۔

اسلام کی خوبی ہی یہ ہے کہ اس کی قوت اس کے اندر ہے کہ اس نے ایمان، اخلاق اور مادی قوت، اِن تینوں کو ایک وحدت میں تبدیل کر دیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات کا حکم نہیں دیا کہ قوت حاصل کرو، اتنی قوت کہ دشمن پر تمھارا خوف اور دبدبہ قائم ہو سکے اور تم اس کو منہ توڑ جواب دے سکو:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال ۸:۶۰)

اور تم لوگ، جہاں تک تمھارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے

والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کرو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

قرآن میں طاقت کے حصول اور گھوڑوں کو تیار رکھنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ محض گھوڑوں تک محدود نہیں بلکہ وہ اس بات کی دعوت ہے کہ اپنے وقت کی بہترین معاشی' سائنسی' عسکری ٹکنالوجی کو اپنی گرفت میں لاؤ۔ اس بارے میں قرآن نے بڑے پیارے انداز میں اپنی بات کہی ہے کہ یہ قوت اتنی ہونی چاہیے کہ تمھارے دشمن کو خوف ہو جو دراصل تمھارا دشمن ہی نہیں' اللہ کا دشمن بھی ہے اور یہ دشمن وہ ہیں جنھیں تم جانتے ہو اور وہ بھی جن کو تم نہیں جانتے لیکن اللہ کو ان کا علم ہے۔

اجتماعی نظام کی اصلاح کے لیے قوت کا حصول ضروری ہے۔ یہ مادی قوت اگر اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہو' اگر اُمت مسلمہ کے شہداء علی الناس کے مشن کو ادا کرنے کے لیے ہو تو یہ عبادت ہے۔ یہ دنیا پرستی نہیں ہے' یہ مادہ پرستی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ دیا ہی اسی لیے ہے کہ اُسے ہم مسخر کر کے اُن اخلاقی مقاصد اور نظریات کے غلبے کے لیے استعمال کریں جو استخلاف کی بنیاد پر ہمارے ذمے کیے گئے ہیں۔

معاشرے اور قیادت کا بگاڑ

ان تین بنیادی چیزوں کے بعد پھر میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت جہاں انفرادی طور پر' الحمدللہ ہمارے معاشرے کے اندر بہت خیر موجود ہے اور میری طرح جن افراد کو بھی دنیا کے گوشے گوشے میں جانے کا موقع ملا ہے' وہ یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ خراب مسلمان معاشرہ بھی اپنے اندر بڑا خیر رکھتا ہے۔ لیکن اس اعتراف کے بعد' یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ آج مسلم معاشرہ' مسلمانوں کا اجتماعی نظام' قانون' اخلاق' معیشت سب زبوں حالی کا شکار ہیں۔ اس پر پردہ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ بگاڑ کی گرفت میں ہیں اور خود پورے معاشرے اور ریاست کی اصلاح اور تعمیرِ نو تابناک مستقبل کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ انفرادی

اصلاح کافی نہیں، دعوت، نیکی کا حکم، برائی کو مغلوب کرنے اور معاشرے اور ریاست کو شریعت اسلامی کے مطابق منظم اور سرگرم کرنا بھی دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

پانچویں چیز مسلمانوں کی قیادت کا بگاڑ ہے۔ اور میں یہاں 'قیادت' کے لفظ کو اس کے وسیع ترین مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں جس میں گھر کا سربراہ، استاد اور تعلیمی ادارے کا سربراہ، معاشی حیثیت سے قیادت کے مقام پر فائز لوگ، اور پھر اجتماعی اور سیاسی قوت اور سربراہی۔ اس وقت اُمتِ مسلمہ کا بہت بڑا مسئلہ قیادت کا بگاڑ اور اسلامی معیار سے کوسوں دُور ہونا ہے۔ عوام کی خامیاں اپنی جگہ، مگر قیادت کا بگاڑ اصل خرابی ہے۔ عوام الناس، عمل میں خواہ کتنے بھی گئے گزرے ہوں، ان کی خواہشات، اور تمنائیں سب کا ہدف دورِ رسالت مآب اور دورِ خلافت راشدہ ہی ہے۔ آپ کسی اَن پڑھ بڑھیا سے پوچھ لیں کہ تم کون سا نظام چاہتی ہو؟ وہ کہے گی کہ مجھے وہ عدل چاہیے جو حضرت عمر فاروقؓ نے دنیا کو دیا تھا۔ یہ احساس موجود ہے۔ لیکن قیادت، اس کا قبلہ، اس کی وفاداریاں، اس کی ترجیحات سب بگاڑ کا شکار ہیں اور عوام اور قیادت کے درمیان ایک سمندر حائل ہے۔ صرف سمندر ہی حائل نہیں بلکہ ان کے درمیان مسلسل کش مکش ہے اور اب تو عالم یہ ہے کہ اس قیادت میں ایسے بدنصیب بھی ہیں جن کو یہ تک کہنے کی جسارت ہوتی ہے کہ کیا میں لوگوں کے ہاتھ کاٹنا شروع کر دوں، اور اس طرح پوری قوم کو لنجا کر دوں۔ انھیں ڈاڑھی اور حجاب کا تمسخر اُڑاتے ہوئے بھی کوئی شرم نہیں آتی۔ یہ بگاڑ بڑا بنیادی بگاڑ ہے۔

ہمیں ان پانچوں دائروں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ہم کسی ایک کو بھی اگر نظرانداز کرتے ہیں تو پھر تابناک مستقبل ایک خواہش تو ہوسکتا ہے، ایک حقیقت نہیں بن سکتا۔ یقین جانیے ان میں سے کوئی مشکل اور کوئی سبب بھی ناقابلِ تسخیر نہیں۔ ہم نے آج بھی ان گئے گزرے حالات میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح افراد کی زندگیاں بدلتی ہیں؟ کس طرح قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں؟ میں دو واقعات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔

دو روشن مثالیں

جب ملایشیا آزاد ہوا تو اس وقت کی حکومت نے یہ طے کیا کہ انگریزوں کی حکمتِ عملی پر

عمل کرتے ہوئے اسکول کے بچوں اور بچیوں کو تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجیں۔ اس کے لیے برطانیہ' آسٹریلیا اور امریکا ان تین ملکوں کا انتخاب کیا گیا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان نابالغوں اور اسکول کی عمر کے بچوں بچیوں کو بھیجا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اس طرح مغرب کے رنگ میں رنگ کر کے آئیں گے کہ پھر زندگی کی انھی رنگینیوں کو ملک میں عام کریں گے۔ اور ہم اس طریقے سے ان کو آزادی دینے کے بعد بھی اپنا غلام رکھ سکیں گے۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ABIM اور اسلامی تحریک وہاں پر انھیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی وجہ سے رونما ہوئی اور بالکل فضا بدل گئی۔

اس سے بھی زیادہ آنکھیں کھولنے والی مثال الجزائر کی ہے۔ ہم نے تو برطانوی استعمار کو دیکھا ہے۔ جس میں فرانسیسیوں کے مقابلے میں پھر بھی کچھ معقولیت تھی۔ کچھ قانون کا احترام تھا۔ کچھ مذہبی رواداری تھی۔ فرانس کا حال تو یہ تھا کہ انھوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے ہی تباہ نہیں کیا' بلکہ اخلاق' تعلیم' حتیٰ کہ زبان' کسی کو نہیں چھوڑا۔ الجزائر میں استعمار کے جارحانہ رویے کے نتیجے میں یہ قوم عربی زبان سے محروم ہوگئی تھی۔ جب ۱۹۵۴/۵۵ء میں وہاں کی قومی محاذ آزادی (این ایل ایف) کے سربراہ یہاں پاکستان آئے تو اس وقت میں جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا۔ ہم ان سے ملنے کے لیے میٹروپول ہوٹل میں گئے۔ ہم اپنے ساتھ ایک عربی کا مترجم لے کر گئے۔ جب ان سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ میں عربی نہیں بول سکتا۔ کوئی فرانسیسی مترجم لائیے۔ یہ کیفیت تھی وہاں کی مسلمان قیادت کی۔

اگر آپ فرانس کی میڈیا پالیسی کو دیکھیں تو سر پکڑ لیں گے کہ فرانسیسی دور اقتدار میں جو فلمیں فرانس میں نہیں دکھائی جاسکتی ہیں' وہ فحش پروگرام الجزائر میں پوری بے باکی سے ٹیلی کاسٹ کیے جاتے تھے۔ مقصد تھا پورے معاشرے کو بگاڑنا اور اخلاقی انارکی میں مبتلا کرنا۔ اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ اسلامی مزاحمت اور اسلامی تحریک نے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا۔ عربی زبان کا احیا ہوا' اسلامی نظام کی پیاس اتنی بڑھی کہ ۱۹۹۲ کے انتخابات میں اسلامی فرنٹ کو تقریباً ۹۰ فی صد ووٹ ملے۔

مزاحمت، اصل طاقت

استعمار کی منصوبہ بندی ہمیشہ سے یہی رہی ہے جس کی تلقین آج بش صاحب اور ان کی ٹیم کر رہی ہے کہ تعلیم کو تبدیل کرو، مدرسوں کو سیکولر رنگ میں رنگو۔ جہاد کا لفظ تو آج نہیں، پہلے دن سے دشمنوں کا ہدف رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام پر غالباً دوسری صدی ہجری کے اندر پہلی تنقیدی کتاب جو ایک عیسائی عالم کی طرف سے آئی ہے، اُس میں اصل ہدف جہاد اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، یعنی نبی پاکؐ کی ذاتِ مبارک اور جہاد کا تصور ہمیشہ سے اصل ہدف رہے ہیں۔ فرانسیسی، برطانوی، فرانسیسی، اطالوی استعماری دور کا مطالعہ کر لیجیے، سب کے سامنے اصل ہدف جہاد تھا۔ خواہ وہ السوسی کی تحریک ہو، خواہ وہ الجیریا کے عبدالقادر کی تحریک ہو، خواہ وہ صومالیہ کی تحریک ہو، خواہ برعظیم کے شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک ہو۔ ہر جگہ آپ دیکھیں گے کہ جہاد ہی نے استعمار کا راستہ روکا اور جہاد ہی کو استعمار نے ہدف بنایا۔ یہ نئی نہیں، بڑی پرانی حکمتِ عملی ہے۔ اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پتا نہیں یہ کیا کر لیں گے لیکن جہاد کا تصور ہو یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی سنت کی مرکزی حیثیت، دشمن کی ساری یلغار کے باوجود ان پر کوئی دھبا نہیں آسکا اور نہیں آسکتا۔ جھوٹی نبوتیں تک برپا کی گئیں لیکن دین حق پر کوئی آنچ نہ آئی۔ اسلام کو دبانے کی جتنی کوششیں ہوئیں، وہ اتنا ہی مستحکم ہوا ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

تاریخ میں ہم پر بڑے سخت دور گزرے ہیں۔ شاید سب سے سخت دور وہ تھا جب چنگیز اور ہلاکو کی فوجوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اور مسلمانوں کی مایوسی اور بے بسی کا عالم یہ تھا کہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر کوئی تاتار مسلمانوں سے کہتا تھا کہ تم لیٹ جاؤ اور انتظار کرو کہ میں اپنے گھر سے اپنی تلوار لے آؤں اور اس سے میں تم کو ذبح کروں تو وہ لیٹے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اپنا خنجر لاتے اور ان کو ذبح کر دیتے۔ یہ کیفیت تھی مسلمانوں کی۔ لیکن اس کے بعد دیکھیے کہ دو سو سال کے اندر اندر پھر حالات بدل گئے اور انھی تاتاریوں کے دل و دماغ کو اسلام نے مسخر کر لیا، جنھوں نے مسلمانوں کو فتح کیا تھا۔ اسلام نے ان کو فتح کر لیا اور بقول اقبال ؎

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وہی تاتار جو مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھا رہے تھے اور شہدا کے سروں سے مینار بناتے تھے' انھی کے ذریعے سے پھر ۴۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکمرانی کا نظارہ چشمِ تاریخ نے دیکھا۔ لہٰذا تاریخ کے نشیب وفراز سے پریشان نہ ہوں۔ لیکن اس میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ میرا اور آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟ غلامی یہ نہیں ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں زنجیریں پڑ جائیں اور ہمارے پاؤں بیڑیوں سے جکڑے ہوئے ہوں' بلکہ غلامی یہ ہے کہ ہم ظلم کی بالادستی کو قبول کرلیں اور مزاحمت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ جہاد نام ہی مزاحمت کا ہے۔ جہاد نام ہے ظلم اور کفر کے غلبے کے خلاف جدوجہد کرنے کا۔ خواہ وہ قلم سے ہو' زبان سے ہو' ذہن سے ہو' مال سے ہو یا جان سے ہو۔ یہ سب اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ اور اس وقت دشمنوں کا یہی ہدف ہے کہ مسلمانوں میں روحِ جہاد باقی نہ رہے۔ ان کا ہدف ہماری قوتِ مزاحمت ہے' شر سے سمجھوتا نہ کرنے کا جذبہ ہے۔ حالات کے آگے سپر نہ ڈالنے کا داعیہ ہے' مقابلے کا جذبہ اور اُمنگ ہے۔ اقبال نے ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی اس پریشانی کا اظہار بڑے واضح الفاظ میں کر دیا ہے ؎

ہے اگر مجھ خطر کوئی تو اِس اُمت سے ہے
جس کے خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

یہ جو شرارِ آرزو ہے' یہ جو ظلم کے آگے ہتھیار نہ ڈالنے اور حق کے لیے جدوجہد کرنے کا جذبہ ہے' یہ ہماری اصل طاقت ہے۔ اگر یہ جذبہ آپ میں موجود ہے تو کوئی آپ کو غلام نہیں بنا سکتا' کوئی ہمیں مغلوب نہیں کرسکتا۔ اور اگر یہاں ہم نے شکست کھا لی تو ہمارے پاس اگر سونے کے انبار ہوں' بنکوں میں ڈالروں کی ریل پیل ہو' حتیٰ کہ اسلحے کی فراوانی ہو' تب بھی ہم غلامی سے نجات نہیں پا سکتے۔ اس لیے اگر آپ مجھ سے ایک لفظ میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ تابناک مستقبل کی ضمانت کیا ہے؟ تو وہ ہے آرزو' وہ ایمان ہے' وہ یہ جذبہ ہے' وہ یہ مزاحمت ہے' وہ یہ احساس ہے کہ ہمیں اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو قبول کرنا

ہے، اس کے داعی بننے کے لیے جدوجہد کرنی ہے۔ اسی سے دنیا اور آخرت دونوں میں ہمارا مستقبل روشن ہوسکتا ہے۔

اتحاد کی ضرورت

میں بات ختم کرنے سے پہلے ایک اور امر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو فتنے اور مشکلات آج ہمیں درپیش ہیں، اُن میں ایک ہمارا آپس کی تفرقہ بازی، کفرسازی، اور جزوی امور کو اتنی اہمیت دے دینا ہے کہ اصول پامال ہوجائیں اور باہم رواداری پارہ پارہ ہوجائے۔ اصول، بنیاد اور متفق علیہ معاملات کو نظرانداز کر کے فروعی، جزوی، غیرمتعلق باتوں میں اُلجھ جانے اور ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے کا مرض ہمارے مخالف بڑی کامیابی سے ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی حکمتِ عملی ہے جس سے ہمارے مخالف ہمیں نان ایشوز میں الجھا کر اصل ایشوز سے جن کو ہمیں مل جل کر حل کرنا ہے، غافل رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی مثال میں آپ کو یہ دینا چاہتا ہوں کہ عراق میں امریکی قوتوں کے غلبے کے بعد جو سب سے زیادہ اہم ایشو اٹھایا گیا وہ یہ ہے کہ عراق میں اتنے شیعہ ہیں اتنے سنی، اور یہ کبھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اور بددیانتی کی انتہا ہے کہ کرد جو آبادی کا پانچواں حصہ ہیں، وہ ۱۰۰ فی صد سنی ہیں مگر انھیں کوئی سنی نہیں کہتے۔ لیکن جو ۲۲، ۲۳ فی صد عرب سنی ہیں انھیں سنی قرار دیتے ہیں اور باقیوں کو شیعہ قرار دیتے ہیں۔ یہی چیز افغانستان میں آپ نے دیکھی۔ پشتون اور فارسی بولنے والے سنی اور شیعہ یعنی یہ سارے تنازعات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ انھی کا پرتو آپ پاکستان میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

میں نے آغاز میں کہا تھا کہ ایمان کے ساتھ ساتھ دین کا صحیح وژن ضروری ہے۔ اور اس وژن کے اندر ایک بڑی چیز ہے: الاقدم فالاقدم کہ جو اہم ہے اسی کو اہم ہونا چاہیے۔ جو مرکزی ہے اسی کو مرکزی ہونا چاہیے۔ جو اصول ہے اسی پر ہماری اصل نظر ہونی چاہیے۔ اور جو اختلاف ہے، جو فروعی ہے اس کے بارے میں ہمیں توسع، رواداری کو اپنانا چاہیے۔ مکالمہ ضرور کیجیے لیکن اس میں اُلجھ کر اصل کو بھول جانا اور ترجیحات کا بگڑ جانا یہ بہت بڑی تباہی ہے۔ میں نے

جتنا مطالعہ کیا ہے، میں آپ سے ایمان داری سے کہتا ہوں کہ اہلِ سنت کے درمیان جو مکاتب فکر ہیں ان میں ۹۵ فی صد ایشوز وہ ہیں کہ جن میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ سارے اختلافات صرف ۵ یا ۶ فی صد معاملات کے اُوپر ہیں۔ اور اگر آپ اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے مابین اختلافی امور کا جائزہ لیں تو یہ زیادہ سے زیادہ بڑھ کر کے ۸ سے ۱۰ فی صد امور کے بارے میں ہیں، جب کہ ۹۰ فی صد امور میں ہم سب مشترک ہیں۔

کیا ظلم ہے کہ ۹۰ فی صد اور ۹۵ فی صد قدر مشترک کو تو ہم بھول جاتے ہیں، اور اس پانچ سات فی صد جس کے بارے میں اختلاف ہے، اس میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ہم اختلاف سے انکار نہیں کرتے لیکن اگر ہم اس اختلاف کو اس کی حدود میں رکھیں، اختلافی امور میں رواداری برتیں اور جو ہمارے مشترکات ہیں اس پر ڈٹ جائیں تو ہماری کتنی بڑی قوت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ فقہ نظامِ زندگی ہے، قانون ہے، ہمارا راہنما ہے۔ لیکن ہماری ترجیحات میں سب سے پہلی چیز قرآن ہونی چاہیے۔ پھر سنتِ رسولؐ، پھر فقہ، اور پھر تاریخ۔ اگر یہ ترتیب آپ رکھیں گے تو کبھی بگاڑ نہیں آئے گا۔ اس سے بڑا سانحہ کیا ہوگا کہ ہم قرآن کو بھول جائیں، سنت کی ہم فکر نہ کریں، فقے میں بھی مشترکات کو ہم نظرانداز کر دیں اور صرف فروعات میں ہی الجھ جائیں تو پھر حالات خراب نہ ہوں تو کیا ہو؟

عزمِ نو

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی صحیح بات کہی تھی کہ لن یصلح آخر هذه الامة الا بما یصلح به اولها ، اِس اُمت کے آخری دور کی اصلاح بھی اُسی سے ہوسکتی ہے جس سے اِس کے پہلے دور کی اِصلاح ہوئی تھی۔ اور وہ ہے قرآن۔ تو آیئے! اس کتابِ ہدایت کو تھام لیں اور غلبۂ اسلام کی اُس اُمنگ کو جو ساری قوت کا سرچشمہ ہے، اِس جذبے کو بیدار اور اُجاگر کریں کہ ہمیں ظلم کے آگے کبھی بھی سپر نہیں ڈالنا بلکہ مزاحمت کرنا ہے۔ اور اگر آپ تاریخ پر غور کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ خیر اور شر کی کش مکش سے ہی قوموں میں ساری تخلیقی قوت (creativity) پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح فزکس میں رگڑ (friction) سے انرجی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح

انسانی زندگی میں بھی اسی کش مکش سے تخلیقی قوت پیدا ہوتی ہے اور طاقت کے نئے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔

تو آیئے! ہم ایمان اور اُمید کا دامن تھام لیں۔ اللہ کو اپنی قوت کا ذریعہ بنائیں۔ اور اپنے عوام کو بیدار اور منظم کریں کہ اللہ کی نصرت کے لیے یہ ضروری ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○ (الانفال ۸:۶۲) ''وہی وہ ذات ہے جس نے اپنی مدد اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید فرمائی''۔ اپنے رب سے مدد طلب کریں۔ تاریکی سے مایوس نہ ہوں۔ بچپن میں' میں نے ایک قطعہ سنا تھا جسے حرزِ جان بنالیا' اس پر بات ختم کرتا ہوں:

یوں اہلِ توکل کی بسر ہوتی ہے
ہر لحہ بلندی پہ نظر ہوتی ہے
گھبرائیں نہ ظلمت سے گزرنے والے
آغوش میں ہر شب کے سحر ہوتی ہے

یہ اشارات اس تقریر پر مبنی ہیں جو مدیر ترجمان القرآن نے ۱۱ مارچ ۲۰۰۵ء کو فاران کلب کراچی کے ایک بڑے اجتماع میں کی جس میں کراچی کے اہل دانش اور تاجر برادری کے سرکردہ افراد شریک تھے۔ ضروری نظرثانی اور اضافوں کے ساتھ۔

(کتابچہ دستیاب ہے۔ قیمت: ۵ روپے۔ سیکڑے پر رعایت۔ منشورات' منصورہ' لاہور۔ فون: ۵۴۳۴۹۰۹)